مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

خدااس دنیا کی سب سے باکمال ہستی ہے۔اس کے جمال وکمال کے نقشے اس کائنات میں ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔مگراس کے کمال کا سب سے بڑا جلوہ خود انسان کی اپنی ہستی ہے۔وہ انسان جسے الرحمٰن نے صفت بیان سے نوازا۔وہ جو ایک پھول کو دیکھ کر گلزار اور ایک مسکراتی نظر پر تلوار کا مضمون باندھ سکتا ہے۔وہ احساسات کی وادی میں جمالیات کے ایسے پھول کھلا سکتا ہے جن کی مہک سے ہر صاحب ذوق کی روح جھوم اٹھتی ہے۔

اس انسان پر خدا اگر احسان کر کے اپنی تعریف کا موقع دیدے تو یہ حاصلِ زیست ہے۔ غافلوں کو عہد بندگی یاد دلانا، غیر اللہ کی محبت کے نشے میں مست لوگوں کو مئے توحید کے جام پلانا، گمراہی کے اندھیرے میں ہدایت کی شمع جلانا، یہ وہ اعزاز ہے جس سے بڑا اعزاز کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

لوگ مال و دولت کے لیے جیتے ہیں۔نام و جاہ کے لیے مرتے ہیں۔قوم وملت کے لیے لڑتے ہیں۔فرقہ وتعصب کے لیے جھگڑتے ہیں۔حالانکہ جینے کا اگر کوئی مقصد ہے تو یہی ہے۔ یہ ہے تو فقیر بھی بادشاہ ہے اور نہیں ہے تو بادشاہ بھی فقیر ہے۔

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل ، مرے احباب نثار

ایسے خدا میں جینا عجیب چیز ہے مگر ایسے خدا کو بھول کر جینا عجیب تر ہے۔

اختلاف اور انتشار

میرے مضامین پر لوگ بہت سے تبصرے کرتے ہیں۔ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں لوگ میرے خیالات سے اختلاف کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل ویلنٹائن کے حوالے سے لکھے گئے ایک مضمون پر ایک صاحب نے مجھے ایک اختلافی ای میل بھیجا۔ان کے ای میل میں اٹھائے گئے نکات پر میرا اطمینان نہیں تھا لیکن اختلاف چونکہ ایک شائستہ انداز میں کیا گیا تھا اس لیے میں نے اپنے مضمون کے ساتھ سائٹ پر وہ اختلافی کمنٹ بھی شائع کر دیا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جس امتحان میں ڈالا ہے آزادی اس کی بنیادی اساس ہے۔اس آزادی کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے سے اتفاق اختلاف کرتے رہتے ہیں۔اس حوالے سے مکالمے کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلہ تب ہوتا ہے جب لوگ ایک دوسرے پر اپنی آرا اور خیالات ٹھونسنا شروع کر دیں۔ان کے جوابی دلائل سننے اور سمجھنے کے بجائے یکطرفہ طور پر اپنے موقف پر قائم رہیں۔دوسروں کی بات سمجھنے اور ان سے دلیل مانگنے کے بجائے اعتراض، الزام اور مہم جوئی کا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ پروپیگنڈے کی مہمیں چلائی جائیں۔لوگوں کی نیت اور اخلاص پر ایسے گفتگو کی جائے جیسے وہ دل کا حال جانتے ہوں۔

یہی رویے معاشرے میں جمود اور انتشار پیدا کرتے ہیں۔ جمود اس لیے کہ ایسی مہم بازی جھیلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ تخلیق کی نئی دنیا تعمیر کرنے والے حساس لوگ کونے میں دب کر بیٹھ جاتے ہیں۔انتشار اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جہاں علمی اور فکری اختلاف پر اہل علم کی شخصیت، کردار اور اخلاص کو ہدف بنا لیا جائے وہاں لوگوں کا ہر شخص پر سے اعتبار ختم ہونے لگتا ہے۔

اس لیے اختلاف رائے ضرور کیجیے مگر شائستگی کے ساتھ اور دوسرے شخص کو بھی حق دیجیے کہ وہ آپ کے ساتھ اختلاف کر سکے۔

اندھے راہ دکھانے والے

''استاد! یہ فرمایئے کہ ہم مذہبی لوگوں کی اس قدر کوششوں کے باجود بھی برائی کیوں بڑھے جارہی ہے؟''، عارف کی مجلس میں آج یہ سوال ایک مذہبی طور پر فعال شخصیت نے اٹھایا تھا۔ عارف نے ایک نظر سائل کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا:

''آپ کی سب سے بڑی دعا کیا ہے؟''، ان صاحب نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر جواب دیا:''ساری دنیا سے برائی مٹ جائے۔ کل عالم میں اللہ کا دین غالب ہوجائے۔ ہمارے ملک میں اسلام نافذ ہوجائے۔''

عارف نے سر جھکالیا۔ مجلس میں خاموشی چھاگئی۔ دیر تک جواب نہ آیا تو سائل نے پہلو بدلا۔ مگر وہ دور بیٹھے تھے۔ دیکھ نہ سکے کہ عارف کی آنکھوں سے آنسوں چھلک رہے ہیں۔ خاموشی کی اس دبیز چادر کو آخر کار عارف کی آواز نے توڑ ڈالا۔

''ہم مذہبی لوگوں کا نشانہ دوسرے ہوتے ہیں۔ مگر ہدایت بندوق کی گولی نہیں ہوتی جس سے دوسروں کو نشانہ بنایا جائے۔ یہ روشنی ہوتی ہے جو دل سے پھوٹتی ہے اور سب سے پہلے ہمارے اپنے وجود کو منور کرتی ہے۔ مگر ہم کبھی اس روشنی کو اپنے رب سے اپنے لیے نہیں مانگتے۔ کبھی رسمی طور پر مانگ لیا تو اپنی شخصیت اور عادات ایسی نہیں بناتے کہ اس روشنی کے مستحق ٹھہریں۔ ہم اپنے تعصّبات، گروہوں ،نظریات اور تصورات کے اسیر ہوتے ہیں اور انھی کو دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ سو نہ ہم نے ہدایت پانے کو اپنا مقصد بنایا نہ خود کو ہدایت پانے کے قابل بنایا۔ ہم پیغمبر تو ہیں نہیں کہ اللہ پاک ہم پر ہدایت بن مانگے اتار دے۔ اس لیے ہمارے اندر اندھیرا رہتا ہے اور انھی اندھیروں کو ہم دوسروں میں بانٹتے ہیں۔

ہم اندھے راہ دکھانے والے ہیں۔ ہمیں سوال یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری کوششوں کے باوجود برائی کیوں ختم نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا اندھا پن کیسے دور ہوگا۔ کیونکہ جس روز یہ دور ہوگیا ہر جگہ ہدایت کی روشنی پھیل جائے گی۔''

ایک ادبی اسلوب

ادبی کلام کا اصل مقصد لوگوں کے ذوق حسن و جمال کو متاثر کر کے ان کے دلوں کے تار کو چھیڑنا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد بات لوگوں کے کانوں تک نہیں ان کے دلوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیے ادبی کلام منطق اور حساب کتاب کی زبان سے ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔

اس کی ایک مثال قرآن وحدیث میں آنے والے وہ بیانات ہیں جو دنیا کے حوالے سے آئے ہیں۔ ان بیانات میں جب دنیا کی مذمت کی جاتی ہے تو اکثر دنیا کی زندگی کے منفی پہلو یا برائیاں زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ ایک سطحی آدمی اس کو پڑھ کر یہ مطلب نکال سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی ہر چیز بری ہے۔ حالانکہ قرآن وحدیث میں دوسرے مقامات پر دنیا، اس کی زینت، اس کی حسنات اور دولت دنیا کو بڑے مثبت پیرائے میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

ایسے میں منفی نوعیت کے مقامات کو سمجھنے کا درست طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے علی سبیل الاختصاص سمجھا جائے۔ یعنی دنیا کی یہ جتنی بھی مذمت اس آیت یا حدیث میں آرہی ہے وہ خاص اسی پس منظر میں ہے۔ بعض اوقات یہ پس منظر سیاق کلام میں ہوتا ہے اور بعض اوقات موقع محل میں اور کبھی سرے سے بیان ہی نہیں ہوتا۔ مگر منطق یا حساب کی زبان کی طرح اس بات کی وضاحت نہیں کی جاتی۔ اس خاص موقع پر دنیا کے مثبت پہلوؤں کو نہیں گنوایا جائے گا۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو پھر کلام اپنی اثر آفرینی، زورِ بلاغت، بیان کی شدت، لہجے کی کاٹ اور احساس جمال و لطافت کے ان تمام پہلوؤں سے محروم ہو جائے گا جو دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اختصاص کا یہ اسلوب نہ کلام کا عیب ہوتا ہے نہ اس سے کوئی غلط فہمی پیدا ہونی چاہیے۔ نہ کوئی انتہا پسندانہ نقطہ نظر ہی اخذ کرنا چاہیے۔ اگر ایسا ہے تو کرنے کا کام قاری اور شارح کی اصلاح ہے نہ کہ کلام اور متکلم کو تنقید کا ہدف بنا لینا۔

اخلاقی تحریک

کیپ ماؤنٹ کراچی کا سب سے زیادہ خوبصورت ساحل ہے۔ یہ ہاکس بے سے آگے کی سمت سب سے آخر میں آنے والا پکنک پوائنٹ ہے۔ یہاں کی اصل خوبصورتی یہ ہے کہ کچی سڑک پر سفر کرتے ہوئے آپ کو چاروں طرف ایک ہموار میدان ملے گا۔ مگر الٹے ہاتھ کی سمت آپ بمشکل سو دو سو میٹر چلیں گے تو اچانک معلوم ہوگا کہ آپ دراصل ایک ہموار پہاڑ کی سطح مرتفع پر کھڑے ہیں اور اس پہاڑ سے نیچے دور دور تک سبزی مائل نیلگوں پانی آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ خاص کر شام کے وقت ڈھلتے ہوئے سورج کی مدھم ہوتی روشنی میں یہ منظر اتنا دلکش ہوتا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔

اس پہاڑی میدان سے نیچے اترنے کے کئی قدرتی راستے ہیں جن کے ذریعے سے لوگ کراچی کے اس سب سے زیادہ صاف ستھرے اور ہموار ساحل تک پہنچتے اور اپنے گھر والوں اور دوسروں کے ہمراہ پتھروں سے محفوظ اس صاف ستھرے اور ریتیلے ساحل پر سمندر کی ہموار موجوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

تاہم یہ ماضی کی باتیں ہیں۔ یہ اس وقت کی کہانی ہے جب انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو اس ملک میں اتنی ارزاں نہیں ہوئی تھی جتنی آج کل ہے۔ اُسی زمانے کا یہ قصہ ہے کہ کچھ لوگ کیپ ماؤنٹ پر پکنک منانے گئے۔ ایک نوجوان لڑکی ساحل سے کچھ دور پہاڑ کے سائے کے نیچے ستانے بیٹھی تو ہوا کی پیہم یلغار سے بوسیدہ ہوجانے والی ایک پہاڑی چٹان اپنی جگہ سے الگ ہوئی اور سیدھی نیچے بیٹھی اس لڑکی پر جا گری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکی کے جسم کے کئی ٹکڑے ہوگئے۔ دھڑ کہیں، ٹانگیں کہیں اور ہاتھ کہیں اور جا گرے۔

اخبارات میں یہ واقعہ بھی شائع ہوا اور اس لڑکی کی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی لاش کی تصویر بھی شائع

ہوئی۔ میں نے جب یہ تصویر دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ کائناتی طاقتیں مادی قوانین پر عمل کرتی ہیں۔ یہ قوانین بالکل اندھے ہوتے ہیں۔ یہ جب روبہ عمل ہوتے ہیں تو انھیں اس کی کوئی پروانہیں ہوتی کہ کسی کی جان جارہی ہے یا کسی کی دنیا برباد ہورہی ہے۔ یہی مادی دنیا کا اصول ہے۔

تاہم انسانی دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک مادی دنیا میں پیدا کر کے اخلاقی حس بھی عطا کی ہے۔ انسان اپنے ہر عمل کو اس اخلاقی حس کی روشنی میں جانچ کر قدم اٹھاتا ہے۔ وہ کیپ ماؤنٹ کی چٹان کبھی نہیں بن سکتا جو اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے یہ نہ سوچے کہ اس کے نتیجے میں کسی کی جان چلی جائے گی۔ یہ اخلاقی حس نہ ہو تو انسان کو اختیار کی جو طاقت اور عقل کی جو استعداد دی گئی ہے وہ اتنی خوفناک ہے کہ انسان اس دنیا کو برباد کر کے رکھ سکتا ہے۔ یہ اخلاقی حس زندہ نہ ہو تو دنیا کا کوئی قانون کوئی ضابطہ انسان کی اس تباہ کن صلاحیت کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔

بدقسمتی سے دور جدید کے ہمارے مصلحین اس حقیقت سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ انسان کے اخلاقی وجود کو طاقتور بنائے بغیر معاشرے کو درست نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف قانون کی طاقت سے معاملات کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات ہر پہلو سے ایک غلط بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشروں کی اصلاح اور ان میں بہتری اس وقت آتی ہے جب تعلیم اور تربیت کے ذریعے سے لوگوں کی اخلاقی حس کو پوری طرح زندہ کر دیا جائے۔ جان، مال عزت و آبرو کے تحفظ کا سبق ان کی گھٹی میں ڈال دیا جائے۔ عدل، احسان، ہمدردی کے اعلیٰ انسانی جذبات کی قدر و قیمت ان کی نظر میں نمایاں کر دی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک اخلاقی تحریک چلائی جائے۔ اس اخلاقی تحریک کے بغیر ماضی میں کبھی کسی معاشرے کی اصلاح ہوئی ہے نہ مستقبل میں اس کا کوئی امکان ہے۔ اس کے بغیر ہمارے ظلم کرنے والے بدل سکتے ہیں۔ معاشرے سے ظلم و بربریت کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

ظفر اور انجم

ظفر ایک اوسط ذہانت کا حامل نوجوان تھا۔ وہ ایک مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اوسط درجے کے تعلیمی اداروں سے تعلیم دلوائی۔ اس کے ماں باپ میں البتہ ایک خوبی کمال کی تھی۔ انھوں نے ظفر کی تربیت کو مسئلہ بنالیا تھا۔ خاص کر دو عادتوں کو انھوں نے ظفر میں بہت پختہ کردیا تھا۔ ایک یہ کہ زندگی کے ہر واقعے کو مثبت انداز سے دیکھنا ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی میں ہر ترقی اور کامیابی محنت، مستقل مزاجی اور سخت جدوجہد کے بعد ملا کرتی ہے۔

ظفر ابھی زیرِ تعلیم تھا کہ اس کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس کی ماں نے اس سے کہا۔ بیٹا یہ بظاہر ایک مسئلہ لگ رہا ہے مگر درحقیقت یہ ایک موقع ہے۔ قدرت نے تمھیں ایک موقع دیا ہے کہ تم وقت سے پہلے پختگی کو پہنچ جاؤ۔ تم اپنی پختگی کی بنیاد پر کم وقت میں زیادہ اور دیر تک رہنے والی ترقی حاصل کرو۔ ظفر نے ماں کی بات گرہ سے باندھ لی۔ تعلیم کے ساتھ ٹیوشن پڑھانا شروع کردی۔ کچھ عرصے بعد ایک پارٹ ٹائم جاب شروع کردی۔ کئی برس اسی طرح گزرے۔ تعلیم ختم ہوئی تو جب اس کے دوسرے دوست ملازمتیں ڈھونڈ رہے تھے وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر ایک بہت بہتر ملازمت حاصل کرچکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد دوران ملازمت اس نے شام کے اوقات میں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اور کچھ ہی عرصے میں ایک اور کمپنی میں اعلیٰ مینجمنٹ کی سطح کی ملازمت حاصل کرلی۔

کچھ ہی عرصے میں اس کی والدہ نے اس کی شادی بہت اچھی جگہ کردی۔ مگر اس کی بیوی انجم کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جہاں بچوں کو بہت اعلیٰ تعلیم دلوائی گئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی بچوں کی pampering کرنا، ان کے ناز و نخرے اٹھانا پرورش کا حصہ تھا۔ چنانچہ انجم کی توجہ ہمیشہ اسی بات پر رہتی تھی کہ اس کے پاس کیا نہیں ہے اور دوسروں کے پاس کیا ہے۔ چنانچہ جلد

ہی مطالبات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسے اپنی ساس کا وجود بھی بوجھ لگتا تھا۔ ظفر نے ابتدا میں کچھ مزاحمت کی تو جھگڑے شروع ہوگئے۔ اب یا تو ظفر ہمیشہ کے لیے ہتھیار ڈال دیتا یا پھر بیوی کے رنگ میں رنگ جاتا۔

ایسے میں اس کی ماں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا: بیٹا زندگی نے تمھیں ایک اور موقع دیا ہے۔ اس سے پہلے تم نے حالات کو شکست دے کر فتح پانا سیکھی تھی۔ اب انسانوں کو جیت کر زندگی میں ایک اور فتح حاصل کرو۔ یہ جنگ جیت لوگے تو تمھاری اولاد بہت اچھی انسان بنے گی۔ قدرت نے تمھیں موقع دیا ہے کہ تم معاشرے کو اعلیٰ انسان فراہم کرو۔

ماں کی بات ظفر کے دل پر اثر کرگئی۔ گرچہ اس کے لیے یہ صورتحال بہت نازک تھی، مگر اس نے حکمت سے اس معاملے سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے فوری طور پر جھگڑوں سے بچنے کے لیے بیوی کی ہر بات کو منع کرنے کے بجائے کچھ قابل قبول مطالبات پورے کردیے۔ ساتھ ہی اس نے غور کیا تو اسے معلوم ہوگیا کہ اس صورتحال کا سبب انجم کی تربیت اور اس کا خاندان ہے۔ انجم کے خاندان میں صورتحال یہ تھی کہ اس کے تین بھائی تھے۔ تینوں خوشحال تھے۔ مگر خوش نہیں تھے۔ تینوں کی بیویاں بھی انھی کے مزاج کی تھیں۔ ان میں آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ مقابلے بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہر کوئی ماں باپ سے فائدے اٹھانا چاہتا تھا مگر ذمہ داری اٹھانے کو کوئی تیار نہ تھا۔

اسے اندازہ ہوگیا کہ میکے کی میراث سے جان چھڑائے بغیر انجم کی اصلاح بہت مشکل ہے۔ مگر ظفر جلد باز نہیں تھا۔ وہ بیوی کو توجہ دلانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا رہا کہ اس کی بیوی اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، اس کے لیے عذاب نہ بنے۔

کچھ ہی عرصے بعد ظفر کی ساس بیمار ہوگئیں۔ مگر ان کے ہر بیٹے اور بہو نے ذمہ داری اٹھانے کے بجائے دوسرے کے سر ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یوں بڑھاپے میں ان کی مٹی پلید ہوگئی۔ ایسے میں ظفر انجم سے کہہ کر اپنی ساس کو اپنے گھر لے آیا۔ انجم تو خیر بیٹی تھی، مگر ظفر نے بھی بیٹے سے بڑھ کر ہر طرح جان و مال سے ان کا خیال کیا۔ ان پر بے دریغ پیسہ خرچ کیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب انجم نے اپنے شوہر کو خواہشات پوری کرنے والی مشین کے بجائے ایک اعلیٰ انسان کے روپ میں دریافت کیا۔

ظفر نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انجم کو سمجھانا شروع کیا کہ اصل خرابی انجم کے اندازِ فکر میں تھی جو اپنی ساس کو بوجھ سمجھتی تھی۔ کسی بزرگ کی خدمت کرنا تو عظیم نعمت ہوتا ہے۔ اسی طرح اس نے واضح کیا کہ وہ انجم کی خواہشات پر پیسہ لٹاتا رہتا تو اس کی والدہ کی مالی مدد نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے انجم کو یہ بھی سمجھایا کہ اس کے بھائیوں کے غلط رویے کی اصل وجہ مادی اندازِ فکر ہے جس میں چیزوں کو انسانوں سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

انجم نے اس عرصے میں اپنے بھائیوں کا جو رویہ دیکھا تھا اس آئینے میں اسے اپنا، اپنے بھائیوں اور اپنے شوہر کا فرق واضح طور پر نظر آ گیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اگر وہ اسی راستے پر چلی تو اس کی اولاد اس کے ساتھ وہی کرے گی جو اس کے بھائیوں نے اس کی ماں کے ساتھ کیا تھا۔ اور اگر وہ اپنے شوہر کی راہ پر چلی تو اس کی اولاد اس کے شوہر جیسی ہوگی۔ انجم نے فیصلہ کرلیا۔ اسے اپنی اولاد کو اپنے شوہر جیسا بنانا ہے۔

اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر سے سابقہ رویے کی معافی مانگی۔ اپنے گھر کو ایک پرسکون جنت بنا دیا۔ اللہ نے کچھ ہی عرصے میں اس کی گود بھر دی۔ اب انجم اپنی ساس کی طرح ایک اور اعلیٰ انسان کی پرورش کر رہی ہے جو آگے چل کر معاشرے میں نجانے کتنی خیر اور برکت پھیلائے گا۔

نقطہ نظر

کہتے ہیں کہ ایک تصویر ہزار الفاظ بول سکتی ہے۔ لیکن یہ تصویر کی نہیں انسانی آنکھ کی خوبی کا بیان ہے جو خارجی دنیا کو سمجھنے اور جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ تاہم آنکھوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس میں کئی محدودیتیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً انسانی آنکھ اپنے سامنے موجود منظر کا مکمل طور پر احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن انسانی ذہن گہرے طور پر اور جزئیات میں جا کر صرف عین نظر کے سامنے والی چیز جس پر انسان کا فوکس ہوتا ہے، اسی کو سمجھتا ہے۔ باقی چیزیں نظر آنے کے باجود انسان دیکھ نہیں پاتا۔

اس بات کو ٹی وی سے باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ کسی نیوز چینل پر چلتی ہوئی خبروں کی پٹی کو پڑھنا شروع کردیں۔ یہ کرتے وقت آپ کی نظر میں ٹی وی اسکرین بلکہ اردگرد کی دیوار یا الماری بھی ہوگی۔ مگر خبروں کی پٹی کو پڑھتے وقت آپ کو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ اس وقت اسکرین پر کیا مناظر بدل رہے تھے۔ ان مناظر کو دیکھنے کے لیے آپ کو نظروں کا فوکس ان کی طرف کرنا ہوگا۔ غرض آپ دنیا کے کسی بھی منظر پر نظر ڈالیں آپ کو بہت کچھ نظر آئے گا لیکن ذہن قبول صرف اسی کو کرتا ہے جسے نظریں گاڑھ کر پوری توجہ سے دیکھا جائے۔ یہیں سے ہماری زبانوں میں نقطہ نظر یا پوائنٹ آف ویو کے الفاظ داخل ہوئے ہیں۔ یعنی وہ فکر جو ہماری نگاہ کا مرکز ہو۔

انسان اس دنیا میں جس آزمائش میں ہے اس میں سب سے بنیادی چیز صحیح نقطہ نظر کو دریافت کرنا ہے۔ اس امتحان میں عمل کی حیثیت ثانوی ہے۔ اگر نقطہ نظر غلط ہے تو زیادہ عمل بھی کچھ نہیں اور نقطہ نظر درست ہے تو تھوڑا عمل بھی نجات کے لیے کافی ہے۔

تاہم صحیح نقطہ نظر کو دریافت کرنے کی اس آزمائش میں اصل مصیبت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں شعور کی عمر میں پہنچنے کے بعد نہیں بھیجا جاتا بلکہ ایک بے سمجھ بچے کے طور پر جنم لیتا ہے اور بڑا

ہونے سے قبل اس کے والدین اور قریبی ماحول اس کا ایک نقطہ نظر بنا چکے ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص عقیدے یا نظریے کو اس کی نگاہوں کا مرکزی خیال بنا چکے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کا شروع میں کوئی خاص نظریہ نہیں ہوتا لیکن کچھ دینی ذوق کی بنا پر وہ کسی گروہ، جماعت یا فرقے میں شامل ہوجاتا ہے اور وہاں یکطرفہ باتیں سنا سنا کر کوئی خاص نقطہ نظر اس کے ذہن کا مرکزی خیال بنا دیا جاتا ہے۔

اب یوں نہیں ہوتا کہ دنیا میں دوسرا کوئی نقطہ نظر پایا نہیں جاتا۔ سب موجود ہوتے ہیں اور انسان کو نظر بھی آرہے ہوتے ہیں، مگر ٹی وی کی پٹی کی طرح چونکہ اس کا ذہن ایک خاص چیز ہی میں دلچسپی رکھتا ہے، اس لیے وہ خبریں ہی پڑھتا ہے اور باقی چیزیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ کوئی دوسرا توجہ دلائے تو وہ اسے غلط اور گمراہ کہتا ہے۔ کبھی وہ دوسری حقیقت کو درست سمجھنا بھی شروع کر دے تو اس کا ابتدائی ماحول زبردست مزاحمت کرتا ہے۔ وہ طرح طرح کے نکتے اٹھا کر اس کے تعصب کو بھڑکاتا ہے اور یوں انسان سچائی کو سامنے پا کر بھی اسے دیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

اس محرومی سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ اس حقیقت کو جان لینا ہے کہ انسان اس دنیا میں حالت امتحان میں ہے۔ اس امتحان میں ناکامی کا نتیجہ جہنم کی آگ ہے۔ یہ امتحان عمل سے پہلے صحیح نقطہ نظر دریافت کرنے کا امتحان ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان نظریں اپنے موجودہ نقطہ نظر سے ہٹائے، دوسرے حقائق غور سے دیکھے اور انھیں سمجھے۔ پھر تقابل کرکے دیکھے کہ سچائی کہاں ہے۔ جو انسان یہ نہیں کرے گا وہ گمراہی کا شدید خطرہ مول لے رہا ہے۔ وہ تعصب کا شکار ہوجائے گا۔ وہ ساری زندگی کنفیوژ ہوکر اس عزم سے محروم رہے گا جو عمل پر ابھارتا ہے۔ یا پھر پہلے خود گمراہ ہوگا اور پھر دوسرے کی گمراہی کا وبال لادے روز قیامت ایک مجرم کے طور پر پیش ہوگا۔

مکاتیب

ابویحییٰ

کال گرل کی اصلاح

برادر عزیز شارق

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

جیسا کہ میں نے پچھلے ای میل میں عرض کیا تھا کہ جب کوئی نوجوان بچی جسم فروشی میں ملوث ہوتی ہے تو اس کی چند ہی وجوہات ہوتی ہیں۔ یا تو وہ مجبور ہوتی ہیں کہ کسی نے ورغلا کر اسے پہلی دفعہ آلودہ کر دیا ہو اور اس کے بعد بلیک میلنگ کر کے مجبور کیا گیا ہو۔ یا گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے۔ صرف غربت اس طرح کی چیزوں کا سبب نہیں بنتی۔ اس کے ساتھ یا تو لڑکیوں کی تربیت اچھی نہیں ہوتی یا پھر ان میں اپنی غربت کو شارٹ کٹ طریقے سے ختم کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غربت اور تنگ دستی کو ختم کرنے کا ایک فوری اور بہت آسان نسخہ ہے۔

آپ کے ای میل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بچی جس کے متلعق آپ مشورہ کر رہے ہیں خراب تربیت کا شکار اور معیار زندگی بلند کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس لیے اس کو سمجھانے کے لیے ترغیب وترہیب کے ہر پہلو سے کام لینا ہوگا۔ یعنی اسے پاکدامنی پر ملنے والے اجر کے بارے میں بھی بتانا ہوگا اور بدکاری پر آخرت کی سخت پکڑ پر بھی توجہ دلانی چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی بتانا ہوگی کہ کال گرل کی زندگی صرف دس سال ہوتی ہے۔ اس کے بعد باقی زندگی مختلف جنسی بیماریوں کے ساتھ گزرتی ہے اور بار ہا بیچ ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس بچی کو یہ کہہ کر بھی سمجھایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں جنسی امراض اور جنسی طریقوں سے پھیلنے والے امراض یعنی

ایڈز، ہیپا ٹائٹس بہت بڑھ چکے ہیں۔اب عملاً یہ ممکن نہیں کہ کوئی لڑکی یہ راستہ اختیار کرے اور اس کے بعد ان موذی امراض سے بچ سکے۔اس لیے آخرت نہ سہی دنیا کی مصیبت سے بچنے کے لیے کال گرل کا کام فوراً چھوڑ دے۔

اللہ ہم سب پر اپنا فضل فرمائے آمین۔

ابو یحییٰ

گناہ اور اپنا محاسبہ

اسلام وعلیکم سر

میرا ایک سوال ہے، سر میں نے آپ کی کتاب حدیث دل میں ایک مضمون مصائب سے بچنے کا راستہ پڑھا۔۔۔سر میں ایک آیت کل پڑھ رہی تھی سورہ بقرہ کی آخری آیت کہ اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور اس سے آگے بھی جو اللہ تعالی نے فرمایا۔پھر اس کے بعد میرے سامنے یہ آرٹیکل آ گیا، سر مجھے لگا سورہ شوری میں بھی اللہ نے فرمایا ہے کہ تم پر جو مصایب آتے ہیں وہ اپنے عمل کی وجہ سے آتے ہیں۔اور میں کافی ٹائم سے مشکل میں ہوں لیکن مجھے لگتا تھا آزمائش ہے۔

کل سے میں اپنے اعمال پر غور کر رہی ہوں،، سر مجھے لگا میں ڈرامہ ٹی وی دیکھ لیتی ہوں جب سب دیکھ رہے ہوں۔کیونکہ دین کو پڑھنا پھر قران کلاسسز میں جانا، میں یہ سب کرتی ہوں باقی بھی الحمداللہ میں نے کچھ سال سے جب قرآن پڑھنا شروع کیا تو میں غلطیوں کو درست کرنے لگی ٹی وی بھی ٹائم ویسٹ ہی ہے لیکن ہم یہ کرتے ہیں۔

سر آپ نے جو لاسٹ پیراگراف لکھا کیا اس کی رو سے میں نے اپنا محاسبہ صحیح کیا؟

دعا گو

عزیٰ عزیز

وعلیکم السلام

بات آپ نے ٹھیک سمجھی لیکن بہتر ہے کہ آپ میری کتاب ''قران کا مطلوب انسان'' کا مطالعہ بھی کیجیے۔ کیا چیز گناہ ہے، وہ آپ کو اصل میں اسی کتاب سے معلوم ہوگی۔ ہمارے ہاں بہت سی چیزوں کو بہت بڑا گناہ بنالیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی نوعیت مباح کی ہے۔ یہی معاملہ ٹی وی کا ہے۔ ٹی وی پر ہر چیز گناہ نہیں ہوتی۔ مثلا ہم ٹی وی کی وجہ سے حرم سے نماز براہ راست دیکھتے ہیں یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اسی طرح قران بھی سنتے ہیں۔ ہاں اگر آپ ٹی وی پر فحش چیزیں دیکھیں گی تو یہ غلط ہے۔

اس اصول کی روشنی مین جائزہ لیں کہ ٹی وی پر آپ کیا دیکھتی ہیں اور پھر فیصلہ کریں۔ اصل ممنوع چیزیں اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرما دی ہیں۔ ان کو قرآن کا مطلوب انسان میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کو اس پہلو سے ضرور پڑھیں۔

اسلام وعلیکم

سر قرآن کا مطلوب انسان میں ایک ٹاپک لغو چیزوں پر ٹائم لگانا ہے۔ ٹی وی پر جو مثبت چیز ہے وہ تو صحیح ہے، لیکن میرا سوال ڈرامہ سے متعلق ہی تھا۔ کیونکہ آپ نے آرٹیکل میں مصایب سے نبچنے کا طریقہ اور جو ہم میں کوتاہیاں ہیں ان کو واضح کیا تھا۔

دعا گو

....

وعلیکم السلام

جی اس پہلو سے یہ بات ٹھیک ہے۔مگر لغویات سے بچنا حدیث کے الفاظ میں بھی حسن اسلام میں سے ہے۔یعنی یہ دین کا جمال وکمال ہے۔ بے فائدہ چیزوں سے بچنا اعلیٰ انسانوں کا طریقہ ہوتا ہے۔مگر یہ براہ راست گناہ نہیں ہے۔جبکہ اس آرٹیکل میں گناہوں سے بچنے کا ذکر ہے۔اس باریک فرق کو ذہن میں رکھیے گا۔

....

یہاں پھر گناہ سے مراد کون سے گناہ ہیں جن کے باعث مصائب آ سکتے ہیں۔

دعا گو

....

گناہ سے گناہ ہی مراد ہیں ۔قرآن کا مطلوب انسان میں میں نے اسے ''حرمتوں کا خدائی ضابطہ کے نام'' سے بیان کیا ہے۔اس میں پانچ بنیادی گناہ گنوائے ہیں۔ پہلا فواحش یعنی جنسی بے راہروی، دوسرا اثم یا منکر یعنی حق تلفی کی نوعیت کے وہ گناہ جنھیں سب برا سمجھتے ہیں جیسے ماں باپ سے بدسلوکی،تیسرا بغی یا زیادتی جیسے کسی کا مال ناجائز کھالینا، چوتھا اللہ کا نام لے کر اپنی طرف سے دین گھڑنا یعنی بدعت اور پانچواں شرک۔ ہر گناہ انھی پانچ میں سے پھوٹتا ہے۔میں نے اس کتاب میں قرآن وحدیث کی روشنی میں تمام گناہ گنوادیے ہیں۔امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

....

جزاک اللہ۔اب جواب سمجھ آ گیا۔

....

سوال و جواب

ابویحییٰ

مسلمانوں کا خدا نظر کیوں نہیں آتا؟

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جب میں کینیڈا میں آئی تو میری عمر 21 سال تھی۔ ایک دن میرے خاوند کے دوست اپنی بیوی گیتا کے ساتھ ہمارے گھر آئے۔ گیتا نے مجھ سے دوستی کرنی چاہی اور کہا کہ کیا میں تمہارے بھگوان کو دیکھ سکتی ہوں؟ مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی۔ یہ میرا کسی غیر مسلم سے ملنے کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سوال پر میں بہت کنفیوژ ہوئی اور اس سے کہا کہ شائد تم ہماری مقدس کتاب کو دیکھنا چاہتی ہو؟ اس پر اس نے کہا کہ نہیں میں تمہارے بھگوان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا وہ اپنے کمرے (closet) میں ہے؟ اور کیا تم وہ مجھے نہیں دکھانا چاہتی؟ اس پر وہ اداس بھی ہوئی۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ تم اپنے بھگوان کو دیکھ سکتی ہو لیکن میں اپنے اللہ کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ حیرانی کے عالم میں کہنے لگی یہ تو ممکن نہیں۔ میں نے کہا کہ تمہارا بھگوان تمہیں نہیں دیکھ سکتا، کیونکہ وہ نہ تو حرکت کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی آنکھیں کھول سکتا ہے۔ لیکن میرا اللہ مجھے دیکھ سکتا ہے پر میں اس کو نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی لیکن اس نے میری بات پر یقین ہی نہیں کیا۔ اور وہ میرے اللہ کو دیکھنے پر اصرار کرتی رہی۔ اس پر اس کے خاوند نے اس کو کہا کہ میں تمہیں گھر جا کر یہ بات وضاحت سے سمجھاؤں گا۔ اس کے بعد اس نے کبھی میرے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ عارفہ ڈار۔

جواب:

محترمہ عارفہ ڈار صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا خدا نظر کیوں نہیں آتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان جس خدا کو مانتے ہیں وہ تمام کائنات کا خالق ہے۔ آج کے دن تک انسان اس پوری کائنات کو تو دیکھ نہیں سکے اور سائنس بتاتی ہے کہ اس کا کوئی امکان نہیں کہ انسان اس پوری کائنات کو کبھی دیکھ سکیں گے۔ جب مخلوق کا احاطہ کرنے کی انسان میں صلاحیت نہیں تو انسان خالق کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اس دنیا میں ہر حقیقت کو براہ راست نہیں دیکھا جاسکتا۔ مثلاً اس وقت میں اور آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس میں ہر طرف آکسیجن ہے جس کے بغیر ہم ایک لمحے میں مر جائیں گے۔ مگر غور کیجیے کہ وہ بھی نظر نہیں آتی۔ وہ قوت کشش (Gravity) جس کو سائنسدان اب ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر بیان کرتے ہیں وہ بھی نظر نہیں آتی۔

اس لیے خدا کا نظر نہ آنا عجیب نہیں ہے۔ عجیب یہ ہے کہ ایک ایسے بت کو خدا بنایا جائے جو نہ بول سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ اس کو الماری سے اٹھا کر آپ گٹر میں پھینک دیں، اس کے ہاتھ، پاؤں اور ناک توڑ دیں، وہ بے چارہ خدا کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ وہ آپ کو نہیں سنبھال سکتا آپ اس کو سنبھال کر احتیاط سے رکھتے ہیں۔ لوگ بے شک ان کی پوجا کریں، انھیں نذرانے چڑھائیں لیکن ایک مکھی بھی ان کی مٹھائی کا کوئی ذرہ لے کر بھاگ جائے تو وہ اس مکھی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ چنانچہ جو خدا اس دنیا میں نظر آتے ہیں ان سب کے ساتھ یہ مسائل ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جو نظر نہیں آتا مگر کائنات میں ہر جگہ اپنی صناعی اور تخلیق میں یہ بتاتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ انسانوں کا وجود میں آنا، درخت کا اگنا، بارش کا ہونا ہر چیز یہ بتاتی ہے کہ اللہ موجود ہے۔ مگر اتنے غیر معمولی کام کرنے والے خدا کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے کسی الماری میں بند کر کے رکھا جاسکے۔

قرآن میں لونڈیاں بنانے کا حکم

سوال: اکتوبر 2013 کے شمارے میں اسلام میں لونڈیوں کے حوالے سے آپ کا مضمون شائع ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس وقت لونڈی سے تمتع کی اجازت تھی تو یہ اجازت کب ختم کی گئی؟ کوئی قرآنی حوالہ دیں، مہتاب۔

جواب: میں نے اپنے مضمون میں یہ بات واضح کی ہے کہ لونڈیوں سے تمتع کی اجازت ایک خاص وقت کے پس منظر میں تھی جب بین الاقوامی قانون اور معاشرتی سطح پر لونڈی غلام بنانے کی اجازت تھی اور قیدیوں کے تبادلے کا کوئی عالمی قانون موجود نہیں تھا۔ قرآن مجید نے اس عالمی انحراف کو فوراً ختم کرنے کے بجائے تدریج کا طریقہ اختیار کیا۔ مگر اپنا عندیہ بالکل واضح کر دیا کہ وہ جنسی تعلق صرف نکاح کی بنیاد پر درست سمجھتا ہے۔

اس کے بعد دنیا میں جو تبدیلی آئی ہے وہ اسلام کی مرضی کے عین مطابق آئی جس میں اب یہ بات قانونی طور پر جائز نہیں ہے کہ کسی آزاد مرد وعورت کو کہیں سے پکڑ کر غلام بنا لیا جائے۔ نیز قیدیوں کے تبادلے کا بین الاقوامی قانون موجود ہے جس کے تحت جنگ میں پکڑے جانے والے قیدیوں کو لونڈی غلام نہیں بنایا جاسکتا۔ ان تمام قوانین پر تمام مسلم ریاستیں پابندی کا عہد کر چکی ہیں۔ ایسے میں کسی طور پر اسلام کی رو سے لونڈی غلام رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اگر کوئی یہ کرنا چاہتا ہے تو اسے قرآن میں غلامی کے خاتمے کا حکم ڈھونڈنے کے بجائے پہلے قرآن میں آزاد عورتوں کو پکڑ کر لونڈیاں بنانے کا حکم ڈھونڈنا چاہیے؟ اس لیے کہ لونڈی سے تمتع کا فائدہ اٹھانے کے لیے پہلی شرط لونڈی کا موجود ہونا ہوتا ہے۔ یہ وہ باریک فرق ہے جو شاید آپ پر علمی طور پر واضح نہیں ہے مگر امید ہے کہ اس گناہ گار کی اس وضاحت کے بعد واضح ہو گیا ہوگا۔

باقی کچھ اور لوگ ہوتے ہیں جو کسی دلیل سے بات نہیں سمجھتے۔ ان کی خدمت میں میرا سوال

یہ ہے کہ آج کے دور میں لونڈیاں کہاں سے آئیں گی۔ پرانے زمانے میں لوگ خواتین کو اغوا کر کے لونڈیاں بناتے تھے۔ کیا لوگ لونڈیوں کے شوق میں یہ کام کرنا چاہتے ہیں؟ جو یہ چاہتے ہیں وہ جان رکھیں کہ پھر یہی معاملہ ان کی ماں بہن، بیٹی اور بیوی کے معاملے میں جائز ہو جائے گا۔ کیا لوگ اس کے بھی قائل ہونا چاہتے ہیں؟

یا پھر آج کے کچھ لوگوں کا ارادہ یہ ہے کہ دشمنوں سے جنگ کر کے ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں تو اس بارے میں بھی اطلاعاً عرض یہ ہے کہ اس ''نیک مقصد'' کے لیے جنگ جیتنا بہت ضروری ہے۔ مگر تادم تحریر مسلمان حربی طور پر غیر مسلموں سے بہت کمزور ہیں اور کسی جنگ کو جیتنے کا امکان زیادہ روشن نہیں۔ ایسے لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ دوسری خواتین کو لونڈیاں بنانے کے شوق میں اگر جنگ کریں گے تو غالب امکان یہ ہے کہ معاملہ الٹا گلے پڑے گا۔ پھر بھی اگر کسی کو لونڈیوں کا بہت شوق ہے تو بسم اللہ کیجیے۔ پھر دیکھیے کہ دنیا کیا کرتی ہے۔

شوہر کو لونڈی گفٹ کرنا

<u>سوال:</u> کیا کوئی خاتون اپنے شوہر کو ایسی لونڈی گفٹ کرسکتی ہے جس کی کفالت وہ خود کرتی ہو۔ لونڈی کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ شگفتہ نسیم

<u>جواب:</u> بیوی شوہر کو لونڈی گفٹ تو کر دے مگر وہ لائے گی کہاں سے؟ آج کل لونڈیاں نہیں ہوتیں۔ کسی کو لونڈی بنانے کی کوشش کی تو پولیس اس بیوی اور میاں دونوں کو بردہ فروشی کے جرم میں اندر کر دے گی۔ ویسے اس موضوع پر میں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ جو اکتوبر 2013 کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اسے پڑھ لیجیے۔

کیا جاب بدلنا خودغرضی ہے

سوال: السلام علیکم!

سر میرا سوال ایمپلائی اور امپلوئیر کے حقوق و فرائض سے متعلق ہے - آج کل پرائیویٹ کمپنیز میں عام رواج ہے کہ ایمپلائز اکثر بہتر مالی فوائد یا ملٹی نیشنل کمپنیز میں جانے کے لئے جاب سوئچ کرتے ہیں، جب کہ چھوٹی کمپنیز کا حساب یہ ہوتا ہے کہ انکے لئے ایک ایک بندہ قیمتی ہوتا ہے، اکثر اوقات تو کسی اہم بندے کے چلے جانے کی وجہ سے کمپنیز کو نقصان بھی اٹھانا پڑ جاتا ہے، کیا یہ رجحان خودغرضی کے زمرے میں آتا ہے؟ کیا یہ کلچر بے رحم سرمایا دارانہ نظام کا نتیجہ ہے؟ اس کے برعکس جاپانی لوگ اپنی پوری عمر ایک کمپنی کے لئے وقف کر دیتے ہیں، اور بالکل ایک خاندان کی مانند کام کرتے ہیں، کیا ہم لوگ اس کلچر کو نہیں اپنا سکتے؟ ویسے اب جاپان میں بھی اس رجحان میں کمی آتی جا رہی ہے۔عرفان رشید۔

جواب: جو سوال آپ نے پوچھا ہے اس میں کسی شخص کے ایک جاب چھوڑ کر دوسری جاب اختیار کر لینے کو غلط صرف اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ جانے والے ملازم نے کسی معاہدے کی خلاف ورزی کی ہو یا پھر سابقہ کمپنی کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا ہو۔محض دوسری جاب اختیار کر لینے کو پہلی کمپنی کے نقصان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے علم کی حد تک ہر باضابطہ کمپنی اور ملازم میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو ایک ماہ کے نوٹس پر چھوڑ سکتے ہیں۔یعنی کمپنی چاہے تو وہ بھی ایک ماہ کے نوٹس پر ملازم کو نکال سکتی ہے۔یہی معاملہ ملازم کا بھی ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے کسی ملازم کا ذاتی فائدے کے لیے بہتر جاب تلاش کرنا غلط نہیں ہے۔ کیونکہ معاہدے کے مطابق خود کمپنیاں یہ بات مان چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایک ماہ کے نوٹس پر خود ملازم کو بھی نکال سکتی ہیں۔اسی طرح ملازم بھی بس ایک ماہ کا نوٹس دینے ہی کا پابند ہوتا ہے نہ کہ زندگی بھر کسی خاص کمپنی میں ملازمت کرنے کا۔

ابو یحییٰ

مضامین قران(6)

ہم دلائل قرآن کے ضمن میں وجود باری تعالیٰ پر قرآن مجید کی دوسری دلیل پر گفتگو کر رہے تھے جسے ہم نے توجیہہ کی دلیل کا نام دیا ہے۔اس دلیل کی اساس سورہ نور آیت نمبر 40 رر کھی گئی ہے۔اس آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا نور ہے۔یعنی اللہ پر ایمان کی روشنی کے ساتھ جب مظاہر کائنات پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو ہر چیز اپنی جگہ درست بیٹھ جاتی ہے۔اوراس کا انکار کر کے انسان سوائے اندھیروں کے کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔اس ضمن میں جو پہلی بات ہم نے واضح کی وہ یہ تھی کہ اس دنیا میں تخلیق و بقا کا سلسلہ ہر جگہ ہر سو کارفرما نظر آتا ہے۔یہ کائنات پیدا ہوئی ہے اوراس کائنات میں ہر جگہ اور ہر لمحہ کچھ نہ کچھ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ سب ایسے سازگار ماحول میں پیدا ہو رہا ہے جسے پیدا کرنے اور باقی رکھنے میں پیدا ہونے والی مخلوقات کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ سازگار حالات باقی نہ رہیں تو تخلیقی عمل فوراً ختم ہو جائے گا۔سوال یہ ہے کہ تخلیق و بقا کے اس لامتناہی سلسلے کو وجود میں لانے اور باقی رکھنے کا سہرا کس کے سر ہے۔قرآن مجید بتاتا ہے کہ یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے۔اس سوال کا کوئی دوسرا جواب آج کے دن تک نہیں دیا جا سکا۔یہی خدا کے ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اس خلاصے کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے زمین و آسمان کے نور ہونے کا دوسرا پہلو کیا ہے۔ یہ پہلو اس کائنات اور زندگی میں پائی جانے والی مقصدیت اور عناصر کائنات میں باہمی ربط ہے۔

۲)ربط و مقصدیت

قرآن مجید نے تخلیق و بقا کے حوالے سے خدا کے خالق ہونے کا جو دعوی کیا ہے، پوری کائنات اس کی تصدیق میں کھڑی ہوئی ہے۔ کائنات اپنی اصل کے اعتبار سے حیات اور زندگی کی بدترین دشمن ہے۔ یہ بلاشبہ زندگی کا قبرستان ہے جس میں زندگی کا باقی رہنا تو درکنار وجود میں آنے کا بھی سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ یہ کائنات کروڑوں ڈگری کی آگ اور ناقابل تصور سردی، زندگی کی ہر حرارت سے محروم خلا، زہریلی گیسوں اور بنجر پتھروں کے سوال کسی چیز کا نام نہیں۔ مگر اس کائنات میں زمین جیسا سیارہ ہے جو اس مادے سے پیدا ہوا جو باقی کائنات میں موجود ہے مگر یہاں زندگی کو وجود میں لانے کے لیے کائنات میں پھیلے موت کے ہر روپ کو قابو کر کے زندگی بخش توانائی میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جو فضا دوسرے سیاروں میں زہریلی گیسوں پر مشتمل ہوتی ہے یا پھر خلا میں ہوتی ہی نہیں وہ یہاں زندگی کا ذریعہ بنادی گئی ہے۔ جو دھرتی دوسری جگہ گیس، برف یا بنجر چٹانوں سے عبارت ہے یہاں زرخیز مٹی کی شکل میں فصل اگا رہی ہے۔ آگ و ٹھنڈ کی انتہائیں جو زندگی کی قاتل ہیں یہاں پورے اعتدال سے موسم اور رنگ تخلیق کرتی ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جگہ جگہ کائنات کی نشانیوں پر توجہ دلا کر یہ کہتے ہیں کہ اس درجے کی متنوع، مختلف اور متضاد کائناتی عناصر کو اس نے اس طرح مسخر کر رکھا ہے اور ان میں باہمی طور پر ایسا نظم، ڈیزائن، تناسب اور توازن ہے کہ یہ سب مل کر حیات کے ناممکن واقعہ کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ اس عمل میں کائنات کس طرح موافق ہو کر کام کرتی ہے اسے صرف ایک مثال سے اس طرح سمجھیں کہ پانی کا ایک گھونٹ ہم پیتے ہیں اس کے لیے کیا نظام کام کر رہا ہے۔ پانی کا اصل ذخیرہ سمندر ہے۔ مگر یہ کھڑا پانی سڑ جاتا ہے اس لیے اسے سڑنے سے بچانے کے لیے نمکین بنا دیا گیا۔ پھر سورج زمین سے ایک مناسب فاصلے پر رہ کر سمندر کو گرم کرتا ہے۔ جس سے نمک

نیچے رہ جاتا ہے اور پانی بھاپ کی شکل میں اوپر اٹھ جاتا ہے۔ پھر فضا اس بھاپ کو بادل بنادیتی ہے اور پھر ہوا اسے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بارش کی شکل میں انسانوں کو سیراب کرتی ہے۔ پھر مستقل استعمال کے لیے یہ پانی زمین کی تہہ میں اسٹور کر دیا جاتا ہے اور کچھ پانی پہاڑوں پر برف کی شکل میں جما دیا جاتا ہے جس کے پگھلنے سے سارا سال دریا بہہ کر انسانی بستیوں کو سیراب کرتے ہیں۔ یہی نظام خوراک بھی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ برسنے والا پانی ہی مردہ دھرتی کو زندہ کر کے وہ پیداوار اگاتا ہے جو انسان اور دیگر مخلوقات کی زندگی کا سبب ہیں۔ یہ بات قرآن کریم میں ان گنت مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ اختصار کے پیش نظر چند مقامات درج ذیل ہیں۔

حج63۔ فاطر27۔ زمر21۔ البقرہ22، 164۔ انعام99۔ رعد17۔ نحل10، 65

قرآن ان میں سے ہر ایک چیز کو سامنے رکھ کر یہ سوال کرتا ہے کہ یہ سارا انتظام کس نے کیا ہے۔ اگر اللہ کو نہیں مانا جائے گا تو یہ جو ہر قدم پر ایک ارادے کی کارفرمائی، مقصدیت، ڈسپلن، تنظیم، ڈیزائن نظر آ رہا ہے اس کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے۔ یہ توازن انتہائی نازک ہے جس میں معمولی سی کمی بیشی سب کچھ برباد کر دے گی۔ جیسے سورج ذرا سا بھی قریب آ جائے تو سارے سمندروں کا پانی بھاپ بن ختم ہو جائے گا اور نتیجتاً زندگی کی ہر شکل کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ مگر کس نے اس سسٹم کو تھام رکھا ہے۔ کون حیات اور پرورش کے اس انتظام کو پوری کائنات پر جبر کر کے باقی رکھے ہوئے ہے۔ یہ پورا نظام بلاشبہ ایک ارادے کا گواہ ہے۔ ارادہ ہے تو ارادہ کرنے والی ہستی بھی ہوگی۔ نظم ہے تو ناظم بھی ہوگا۔ ڈیزائن ہے تو ڈیزائنر بھی ہوگا۔ ربوبیت ہے تو رب بھی ہوگا۔

ایک شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہم اس دعویٰ کو نہیں مانتے ۔ یہ سب اتفاق کی کارفرمائی

ہے۔کروڑوں برس کے ارتقا کے نتیجے میں یہ سب آپ سے آپ ہوگیا۔اربوں ستاروں میں سے ایک سیارے یعنی زمین پر اتفاق کی یہ زنجیر چلی اور زندگی ایک سادہ خلیہ سے شروع ہوکر بتدریج اتنی پیچیدہ ہوگئی۔ یہ بات ٹھیک ہونے کا ایک امکان ہوسکتا ہے،مگر جنیٹک سائنس کی ترقی نے اب یہ حقیقت کھول دی ہے کہ حیات اپنی سادہ ترین سطح پر بھی اتنی زیادہ ہی پیچیدہ ہے اور وہاں بھی وہی پیچیدہ ترین نظام چل رہے ہیں جن کے لیے یہ ماننا ضروری ہے کہ کسی ارادہ کرنے والی ہستی، کسی ناظم ، کسی ڈیزائنر نے وہاں بھی ویسا ہی ایک سسٹم بنا رکھا ہے جیسا کہ سورج،سمندر،فضا،ہوا،بادل، پہاڑ،دھرتی اور دریا کو ملا کر ہمیں پینے کا پانی دیتا ہے۔ یہ بات محض ایک مفروضہ ہے کہ زندگی ابتدائی سطح پر بہت سادہ ہے۔ زندگی ابتدائی سطح پر بھی انتہائی پیچیدہ ہے۔اس کو وجود میں لانے کے لیے ضروری تھا اور اس کو باقی رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ کوئی ناظم،کوئی رب،کوئی ڈیزائنر مانا جائے۔زندگی کی جو مقصدیت اس بظاہر بے مقصد کائنات میں نظر آتی ہے اس کی توجیہ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں۔

۳)وجود انسانی کی اندرونی پکار

گرچہ یہ دو باتیں ہی جو ہم نے اوپر بیان کی اس حقیقت کو کھول دیتی ہیں کہ یہ کائنات اپنے وجود کی خاموش آواز میں پکار پکار کر یہ کہتی ہے کہ اس کا ایک خالق اور مالک ہے جو اسے پال رہا ہے۔مگر اس کائنات میں انسان جیسی مخلوق بھی پائی جاتی ہے جس کی فطرت کے اندر اپنی ہستی کا شعور،خدا کا تصور، خیر و شر اور سب سے بڑھ کر عقل و فہم کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں۔انسان کی اس ہستی کا تجزیہ ہم پہلی دلیل کے تحت کر چکے ہیں اور اس دلیل کے آغاز پر خلاصہ بھی بیان کر چکے ہیں۔سورہ نور ی زیر بحث آتی کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ اس شخصیت کو سامنے رکھتے ہیں کہ اس نور کا ماخذ خارج نہیں خود انسان کا اپنا وجود ہے۔

''اُس کے نور کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس ایسا ہو جیسے ایک چمکتا ہوا تارا۔ یہ چراغ زیتون کے ایسے شاداب درخت کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اُس کا روغن آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑکا پڑتا ہو۔ روشنی پر روشنی! اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ (یہ ایک تمثیل ہے) اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے بیان کرتا ہے۔ (وہ ہر ایک سے وہی معاملہ کرتا ہے جس کا وہ سزاوار ہے) اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

یہاں طاق سے مراد انسان کا حیوانی وجود ہے۔ چراغ انسان کا نفسی وجود یا اس کی شخصیت ہے جسے ہم نے انسان کی ہستی یا انا کا نام دیا۔ فانوس یا شیشہ عقل وفہم کی صلاحیتیں ہیں اور تیل فطرت میں موجود روحانیت کا احساس ہے۔ انسان کا یہ اپنا وجود خود اپنی توجیہہ چاہتا ہے۔ اس کی عقل کائنات کو دیکھ کر سوالات اٹھاتی ہے۔ اس کی فطرت اپنی خاموش صدا میں خدا کو تلاش کرتی ہے۔ یہ تلاش اتنی شدید ہے کہ خدا نہ ملے تو انسان غیر خدا کو خالق کے مقام پر بٹھا دیتا ہے، مگر وہ کبھی خدا کے تصور کے بغیر نہیں زندہ رہا۔ کائنات کے بقیہ حقائق کی طرح اس بات کی بھی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ انسان میں خدا کا اتنا گہرا تصور کیسے آ گیا۔ منکرین اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ہزاروں برس کے خارجی تصورات اور حالات کا نتیجہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہ تصور خارج سے آیا ہے تو خارجی حالات کے بدلنے پر اس تصور کو بھی ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ کہا جاتا ہے کہ انسانی معاشرت میں عورتوں کو ابتدا میں مرکزی اور برتر مقام حاصل تھا۔ مگر زراعتی دور میں عورت کا مقام پست ہو گیا۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ صنعتی دور اور اب انفارمیشن ایج میں خواتین کی حیثیت تیزی سے تبدیل ہو چکی ہے۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ ہزاروں برس تک انسان سورج، چاند، ستاروں اور دیگر کائناتی مظاہر کو پوجتا رہا۔ مگر وقت بدلا

تو یہ پرستش کے بجائے تحقیق کا موضوع بن گئے۔ مگر خدا کا معاملہ یہ ہے کہ حالات کچھ بھی رہے ہوں انسان خدا کو زندگی سے نہیں نکال سکا۔ اس کا مقام نہیں بدل سکا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرکانہ تصورات کے تحت جن دیگر خداؤں کو تخلیق کائنات میں سے کچھ حصہ دیا جاتا تھا آج ان کی یہ حیثیت نہیں رہی۔ مگر خدا آج بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ غیر خدا ہوں، مظاہر کائنات ہوں یا عورت کا معاملہ ہو، ان سب کی حیثیت خارجی تصورات سے متعین ہوئی تھی اس لیے بدلتی رہی۔ خدا اصل میں اندرونی آواز ہے اس لیے اس کا تصور ہمیشہ سے اپنی جگہ باقی رہا ہے۔ وجود انسانی کی یہی وہ شہادت ہے جو بتاتی ہے کہ خدا موجود ہے۔

قرآن مجید اس تمثیل میں یہ واضح کرتا ہے کہ فطرت کا یہ تیل جیسے ہی نورنبوت سے روشنی پاتا ہے تیزی سے بھڑک اٹھتا ہے۔ پھر عقل کے شفاف فانوس سے گزر کر اس کی روشنی میں پوری کائنات کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور ہر چیز اپنی جگہ واضح ہو جاتی ہے۔

ظلمات

اس آیہ نور میں قرآن کریم یہی واضح نہیں کرتا کہ اللہ پر ایمان کے نور سے کائنات کی ہر شے اپنی جگہ پا لیتی ہے بلکہ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جب انکار کر دیا جاتا ہے تو سوائے اندھیروں کے کچھ بھی نہیں بچتا۔ اس سلسلہ کلام کے آخر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا، کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے، جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔ (النور 24:40)

اللہ کے وجود کے سوا انسان اپنی تاریخ میں کبھی اس سوال کا جواب دے ہی نہیں سکا کہ یہ کائنات کس نے بنائی ہے۔ ڈھائی تین ہزار سال میں انسان نے جو کچھ سوچا اور جسے فلسفے کا علم

کہا جاتا ہے، اس کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انسان کے پاس خدا کے سوا اس سوال کا کوئی قابل قبول جواب ہی نہیں۔ پچھلے تین ہزار برسوں میں فلسفیوں نے خدا کے علاوہ اس کائنات کی جو توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے اس سے دو ہی جوابات سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا مگر وہ کائنات میں سرائیت کیے ہوئے ہے۔ اس کے بارے میں ایک فلسفی نے بجا کہا ہے کہ یہ انکار خدا کا مہذبانہ طریقہ ہے۔ گویا کہ اصل جواب ایک ہی ہے کہ کائنات کا کوئی خالق نہیں اور یہ آپ سے آپ وجود میں آئی ہے۔

یہ بات علم، عقل، فطرت اور وجدان غرض ہر پہلو سے ایک ناقابل قبول بات ہے۔ اسی کی تفصیل پیچھے ہم نے بیان کی ہے کہ کس طرح اس کائنات میں موجود تخلیق و بقا کا سلسلہ، کائنات و مخلوقات میں موجود ربط و نظم، مقصد و معنویت اور ترتیب و توافق کا سلسلہ اور ان دونوں سے قبل انسان کے اندرونی وجود کی روحانی پکار سب مل کر اس بات کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود بنی اور خود بخود ہی چل رہی ہے۔ کائنات کی یہ تخلیقی فیکٹری، اس میں پائی جانے والی کامل حکمت اور اس میں کھڑا ہوا باشعور انسان سب ہمیشہ سے انکار خدا کے تصور کو رد کرتے آئے ہیں۔ اس انکار کو قرآن مجید اندھیرے در اندھیرے کا وہ سلسلہ کہہ رہا ہے جس میں انسان کو اپنا آپ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ خدا کے علاوہ کائنات کی کسی دوسری توجیہ کا کبھی سامنے نہ آنا اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ خدا کے سوا اس دنیا کی کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔

ابو یحییٰ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبور میں پیش گوئی

محترم قارئین! قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے متعدد دلائل بیان ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک دلیل جو بار بار دہرائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ پچھلے صحیفوں میں آپ کی آمد کی متعدد پیش گوئیاں بیان ہوئی ہیں اور بلاشبہ آپ ان صحیفوں میں بیان کردہ انبیا علیہم السلام کی پیش گوئیوں کا واحد مصداق ہیں۔

حضرت داودؑ اور حج بیت اللہ

مسلمان اہل علم پچھلی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان پیش گوئیوں کی تفصیل بیان کرتے رہتے ہیں۔ان میں سے ایک پیش گوئی اس طرح بیان کی جاتی ہے جو انجیل میں حضرت عیسی علیہ السلام کے الفاظ میں کتاب متی (باب 21:42-44) میں اس طرح بیان ہوتی ہے۔

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا

وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا

یہ خداوند کی طرف سے ہوا

اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔

اس پیش گوئی کا پورا مطلب ہم مضمون کے آخر میں بیان کریں گے۔سر دست یہ بات سمجھ لیں کہ یہ پیش گوئی اصل میں حضرت عیسیٰ کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ پہلے ہی سے یہود کی کتب میں لکھی ہوئی موجود تھی۔ چنانچہ اس پیش گوئی سے پہلے سیدنا مسیح یہودی علماء اور سرداروں سے فرماتے ہیں:

"کیاتم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا......"

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پیش گوئی کتاب مقدس میں حضرت عیسیٰ کے آنے سے پہلے ہی کردی گئی تھی اور اس کی اہمیت کی بنا پر حضرت عیسیٰ نے اس کو نہ صرف دہرایا بلکہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس میں اضافہ بھی کیا۔یعنی اصل میں یہ آنجناب کی پیش گوئی نہیں بلکہ کسی اور ہستی کے الفاظ ہیں جنھیں آپ نے دہرایا اور مزید وضاحت کی ہے۔

قدیم صحف سماوی پر گہری نظر رکھنے والے یہ بات جانتے ہیں کہ یہ پیش گوئی دراصل حضرت داؤد علیہ السلام کی ہے اور یہ زبور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کی جانے والی اہم ترین پیش گوئی ہے۔تاہم اس پیش گوئی کو جب انجیل سے لیا جاتا ہے تو اس میں استعمال ہونے والی تشبیہ و تمثیل یعنی پتھر اور کونے کا پتھر کی اصل معنویت کسی کو سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کہ یہ حقیقت معلوم نہ ہو کہ یہ پیش گوئی حضرت داؤد نے حج ادا کرتے ہوئے حرم پاک کے سامنے کی تھی۔

حضرت داؤد کے حالات زندگی

قارئین کو شاید یہ بات کچھ عجیب لگے کہ حضرت داؤد نے حج کب ادا کیا لیکن ان کی اپنی کتاب تورات میں اللہ کی حمد کے جو مزمور (گیت) انھوں نے گائے ہیں نیز دیگر تاریخی حقائق بھی یہ واضح کرتے ہیں کہ حضرت داؤد نے نہ صرف یہ سعادت حاصل کی تھی بلکہ اپنی یہ مشہور پیش گوئی بھی اسی وقت کی تھی۔ یہ پیش گوئی یہودیوں میں اتنی معروف تھی کہ سیدنا مسیح نے بغیر کسی خاص حوالے کے بے تکلف اسے ان کے سامنے بیان کر دیا۔

حضرت داؤد کے متعلق تاریخی طور پر مسلمانوں کو بہت کم معلومات حاصل ہیں۔حالانکہ وہ سلسلہ نبوت و رسالت کے اہم ترین لوگوں میں سے ایک ہیں، زبور جیسی مشہور آسمانی کتاب ان

پر اتری اور قرآن کریم میں جا بجا ان کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پیش گوئی پر کچھ بات کرنے سے قبل کچھ حضرت داوٗد کا ذکر کر دیا جائے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان کے حالات زندگی کو سمجھے بغیر یہ پیش گوئی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتی۔

سیدنا داوٗد کا زمانہ ہزار قبل مسیح کا بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم کے ایک ہزار برس بعد اور مسیح سے ہزار برس پہلے کا زمانہ۔ حضرت داوٗد سے تقریباً پانچ سو برس قبل حضرت موسیٰ کی زیر قیادت بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات مل گئی تھی۔ آپ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے جانشین یوشع بن نون کی زیر قیادت فلسطین کو فتح کر لیا۔ مگر اس کے بعد انھوں نے ایک منظّم ریاست قائم نہیں کی۔ بنی اسرائیل مختلف ٹولیوں میں بٹ کر اس مفتوحہ علاقے میں بکھر گئے۔ اس کے بعد آنے والی صدیوں میں بنی اسرائیل اردگرد موجود مشرک قبائل کا اثر قبول کر کے مختلف انحرافات اور گمراہیوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ جس کے نتیجے میں بطور سزا اردگرد کی مشرک اقوام کو ان پر غلبہ دے دیا گیا۔ ان کا مقدس تابوت جسے تابوت سکینہ کہا جاتا تھا اور جو ان کے مذہبی اعمال کی ادائیگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا وہ بھی ان سے چھین لیا گیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جس میں حضرت داوٗد کی پیدائش ہوئی۔ ایسے میں یہود نے اپنے پیغمبر شیموئل (یا سیموئل) سے اپنی قوم کے لیے ایک بادشاہ بنانے کی دعا کی تاکہ اس کے تحت جنگ کر کے وہ مشرکین کے خلاف فتح حاصل کریں اور اپنا مقدس تابوت اور مفتوحہ علاقے واپس لے سکیں۔ قرآن مجید کی سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے اصرار پر طالوت (ساوٗل) کو ان کا بادشاہ بنایا گیا۔ اور ان کی تقرری من جانب اللہ ہونے کی نشانی یہ مقرر کی گئی کہ ان کے دور میں تابوت سکینہ یہود کو واپس مل گیا۔ پھر ان کی زیر قیادت یہود نے جالوت کی مشرک فوج کو شکست دے کر فلسطین پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں حضرت داوٗد نے

جالوت کو قتل کیا اور بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر دی۔

تاہم بعد میں ان کی مقبولیت اور بحیثیت ایک فوجی جرنل ان کی کامیابیوں سے بادشاہ ان سے خائف ہو گیا اور ان کی جان کے درپے ہو گیا۔ چنانچہ وہ جان بچانے کے لیے محل سے نکل گئے۔اس کے بعد بادشاہ کے ہرکارے ان کے تعاقب میں رہے اور وہ جان بچانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔یہی وہ زمانہ ہے جس میں کی جانے والی مناجات اور حمدیہ گیتوں سے زبور کا آغاز ہوتا ہے۔ساؤل یعنی طالوت کی وفات کے بعد آپ فلسطین کے بادشاہ بنے اور آخر کار پورے فلسطین کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

حضرت داؤد کا سفر حجاز

جس زمانے میں حضرت داؤد ساؤل بادشاہ سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے، ان کے سرپرست سیموئیل نبی کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد فلسطین ان کے لیے بالکل غیر محفوظ ہو گیا۔ چنانچہ یہی وہ دور ہے جس میں وہ فلسطین سے ہجرت کر کے دشت فاران تشریف لے گئے، (کتاب سموئل 1:25)۔فاران کے نام سے بائبل میں دو علاقوں کا ذکر آیا ہے۔ایک مصر کے صحرائے سینا کا وہ علاقہ جس میں حضرت موسیٰ کی قوم فرعون کی غرقابی کے بعد پہنچی تھی۔ دوسرے سرزمین عرب کا شہر مکہ جہاں خود بائبل کے مطابق حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو آباد کیا تھا، (کتاب پیدائش 21-17:21)۔ حضرت داؤد چونکہ فلسطین کے بادشاہ اور وہاں کی دیگر مشرک اقوام کی پہنچ سے دور نکلنا چاہتے تھے، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ فلسطین کے علاقے صحرائے سینا گئے ہوں۔ بلکہ قرین قیاس یہی ہے کہ وہ مکہ ہی تشریف لائے ہوں گے جو صحرا کے دور دراز سفر کی وجہ سے اہل فسلطین کی پہنچ سے دور ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔

یہی وہ وقت ہے جب آپ نے حج بیت اللہ ادا کیا۔ اس روح پرور قیام کی یاد تا زیست آپ کو اس طرح ستاتی رہی کہ بعد میں پورے فلسطین کا بادشاہ بننے کے بعد بھی آپ اسے یاد کرتے رہے اور زبور کا ایک پورا مزمور (زبور: 84) اسی سفر حج کی یادوں پر ہے جس میں وہ مکہ کا ذکر اس کے قدیم نام ''بکہ'' سے کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ قرآن مجید میں بھی یہود سے مکالمہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے مکہ کو بکہ کے نام ہی سے بیان کیا ہے، (آل عمران 96:3)۔ اس مزمور میں وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ وہ بادشاہ کے بجائے اللہ کے گھر کے دربان ہوتے ۔ یہ پوری تحقیق تمام تر تفصیلی دلائل کے ساتھ ، جناب عبدالستار غوری کی کتاب ''اکلوتا فرزند ذبیح اسحاق یا اسماعیل''، میں پڑھی جاسکتی ہے۔

[یہ مضمون جاری ہے جس کی دوسری اور آخری قسط اگلے ماہ شائع کی جائے گی]

برائی سے بچنے کا آسان حل
لوگوں کو برائی سے روکنا ہے
کیونکہ اس کے بعد لوگ آپ کو
برائی نہیں کرنے دیں گے (ابو یحییٰ)

مشکل میں اللہ کو یاد رکھنا مشکل نہیں
اصل مشکل آسانی میں اسے یاد رکھنا ہے (ابو یحییٰ)

پروفیسر محمد عقیل

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے

اصول نمبر10۔ ماضی مر چکا ہے

کیس اسٹڈی

وہ نفسیات کی کلاس تھی۔ پروفیسر صاحب کے آنے کا انتظار تھا۔لیکن پروفیسر صاحب کی ٹیبل پر ایک دودھ کی بوتل رکھی تھی۔تمام طلباء اس مخمصے میں تھے کہ آخر اس بوتل کا کیا مقصد ہے۔ ابھی چہ مہ گوئیاں جاری تھیں کہ اچانک پروفیسر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔کلاس میں ایک سکوت طاری ہوگیا۔اچانک پروفیسر صاحب نے بوتل اٹھائی اور دیوار پر دے ماری۔سب ارے ارے کرتے رہ گئے لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بوتل ٹوٹ چکی تھی اور سارا دودھ بہہ گیا تھا۔اچانک پروفیسر صاحب نے سوال کیا:

" کوئی ہے جو اس دودھ کو واپس بوتل میں ڈال سکے؟"۔سب نے نفی میں جواب دیا۔ پروفیسر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے:

"یہ دودھ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔اور ماضی پر ماتم نہیں کرنا چاہیے۔ جو دودھ ضائع ہوگیا اس پر ماتم مت کرو، اسے بھول جاو اور آگے کا سوچو"۔

وضاحت

ماضی ایک اٹل حقیقت ہے لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں واپس نہیں جایا جاسکتا۔ جو واقعہ ایک منٹ قبل ہوا وہ ماضی کا حصہ بن گیا اور اب وہ ہمارے اختیار میں نہیں۔المیہ یہ ہے کہ ہم یا تو ماضی کے پچھتاووں میں زندگی گذارتے ہیں یا مستقبل کے اندیشوں میں۔اس ماضی اور مستقبل کے درمیان حال ہے جو اصل زندگی ہے۔گزرے ہوئے خوشگوار لمحے کم یاد رہتے

ہیں لیکن ناگوار واقعات ہمارے لاشعور میں بعض اوقات چپک جاتے ہیں۔ کسی کو باپ کے مرنے کا غم چین نہیں لینے دیتا تو کسی کو اولاد کی کی جدائی کا افسوس ہوتا ہے۔ کوئی ماضی کی بے عزتی پر ملول رہتا ہے تو کوئی عشق میں ناکامی کو دل کا روگ بنالیتا ہے۔ کسی کو اپنے جمے ہوئے کاروبار کی یاد ستاتی ہے تو کوئی تعلیم میں پیچھے رہ جانے پر شب وروز ماتم کرتا ہے۔

حقیقت ہم سب جانتے ہیں کہ ماضی کا نقصان ہماری اپنی کوتاہی کی بنا پر ہوا ہو یا قسمت کی بے وفائی کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں ماضی میں جاکر نقصان کو فائدے میں نہیں بدلا جاسکتا۔ چنانچہ اسے بھلادینا، اپنے لاشعور سے نکال پھینکنا اور صبر واستقامت سے کام لینا ہی عقلمندی ہے۔

ماضی کو بھلانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے سبق حاصل نہ کیا جائے۔ اگر ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھا جائے تو ایک ناکام ماضی کامیاب مستقبل کی نوید بن سکتا ہے۔ یہ نہ صرف ماضی کے قابل تلافی نقصانات کو فائدے میں بدل سکتا ہے بلکہ ایک مثبت زندگی کی داغ بیل بھی ڈال سکتا ہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ماضی کے نقصان پر غم بالکل نہ ہو۔ ایسا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ جب چوٹ لگے گی تو دکھ ہوگا لیکن پہلے اسٹیپ میں اس غم پر واویلا کرنے کی بجائے صبر و تحمل سے کام لیا جائے اور غم کے نامعقول اظہار سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ دوسرے اسٹیپ میں اس صدمے کو پالا نہ جائے۔ تیسرے اسٹیپ میں یہ دیکھا جائے کہ کن اسباب کی بنا پر یہ صدمہ ملا۔ اگر یہ اللہ کی طرف سے تھا تو اس کی قضا پر راضی رہا جائے۔ اگر یہ ہماری کسی کوتاہی کی بنیاد پر ہوا تو آئیندہ اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسائنمنٹ

- ان ماضی کے پچھتاووں کی فہرست بنائیے جن پر آپ اکثر ملول وغمزدہ ہوجاتے ہیں۔
- ان صدموں کو دو کالمز میں لکھیں کہ کونسے واقعات آپ کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوئے اور کون سے آپ کے اختیار سے باہر تھے۔
- وہ واقعات جو آپ کی اپنی وجہ سے ہوئے ان کا سد باب تحریر کریں اور آئیندہ ان سے بچنے کی کوشش کریں۔
- اس کے بعد ماضی پر پچھتانا چھوڑ دیں کیونکہ جو دودھ بہہ گیا اس پر واویلا عقلمندی نہیں۔

جسے گرم روزے کی پیاس متقی نہ بناسکی
اسے کوئی اور چیز کیسے متقی بناسکتی ہے
جسے ٹھنڈے پانی کا افطار شکر گزار نہ بناسکا
اسے کوئی اور چیز کیسے شکر گزار بناسکتی ہے (ابویحییٰ)

زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح
آخر کار گزر جاتے ہیں (ابویحییٰ)

جن انسانوں کی انا بہت مضبوط ہوتی ہے
ان کی شخصیت اکثر بہت کمزور رہ جاتی ہے (ابویحییٰ)

پروفیسر محمد عقیل

خدا اور ماں

عام طور پر خدا کی محبت کو ماں کی محبت سے سمجھایا جاتا ہے۔ یہ بات اپنی اصل میں غلط نہیں کیونکہ اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرنے والی جو ہستی ظاہر میں نظر آتی ہے وہ ماں ہی ہے۔ لیکن اس مثال سے بعض اوقات کئی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں اور اللہ سے تعلق افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بہت ضروری ہے کہ اس مثال سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو سمجھا اور دور کیا جائے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ماں اپنے جس بچے سے محبت کرتی ہے اسے کبھی آگ میں نہیں ڈالتی تو خدا اپنے جس بندے سے محبت کرتا ہے اسے آگ میں نہیں ڈالتا۔ یعنی یہاں پر محبت کی شرط عائد ہے۔ لہٰذا کسی بیٹے نے اپنی ماں کے شوہر کو قتل کر دیا ہو، اس کی بیٹیوں کو گھر سے نکال دیا ہو، اس ماں کی تذلیل کی ہو تو ایسی ماں کی محبت نفرت میں بدل جائے گی اور وہ عدل وانصاف کی خاطر ایسے بیٹے کو ضرور انصاف کے کٹہرے میں لانا پسند کرے گی خواہ اس کے فرزند کو پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر ایک شخص خدا کا باغی، منکر، اس سے نفرت کرنے والا، اس کی مخلوق کو ستانے والا، قتل کرنے والا اور اس کے نام پر جھوٹ بولنے والا ہو تو خدا اس سے ہرگز محبت نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ اس باغی، ظالم، قاتل اور ہتھیارے کو انصاف کے تقاضوں کے تحت ضرور سزا دے گا۔

ماں کی محبت میں ایک اور مشاہدہ سامنے آتا ہے۔ ماں کی محبت بعض اوقات جذبات اور مصلحتوں کا شکار ہو جاتی ہے،۔ چنانچہ وہ اپنے بچے کی غلطیوں کو درست سمجھتی، اس کی سرکشیوں کو شرارت گردانتی، اس کے گناہوں پر پردہ ڈالتی اور اس کی ہر صحیح وغلط بات پر اسے سپورٹ کرتی

نظر آتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ یا تو جذبات کی مغلوبیت کی بنا پر کرتی ہے یا پھر معلومات کی کمی کی وجہ سے۔ خدا ان کمزوریوں اور خامیوں سے پاک ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا، اس کا محبوب بندہ بھی اگر غلطی کرے تو وہ اسے غلطی ہی گردانتا اور اس کی معافی اپنے قاعدے اور قانون کے تحت ہی کرتا ہے۔ چونکہ کامل علم رکھتا ہے اس لئے وہ بندے کی نیت دیکھ کر جان لیتا ہے کہ وہ کس سلوک کا مستحق ہے۔ ایک ماں جانبداری و مغلوبیت میں عدل و انصاف سے روگردانی کرسکتی ہے لیکن خدا کبھی جانبداری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

خدا اور ماں کا کوئی موازنہ نہیں۔ لیکن اگر خدا کی محبت کو ماں کی محبت سے سمجھنا ہے تو افراط و تفریط سے گریز کرنا اور خدا کو ایک عاجز اور مخلوق ماں کی جگہ پر رکھنے سے گریز کرنا ہوگا۔ ورنہ تو غلط نتائج اخذ ہونے کا اندیشہ ہے۔

قانون بگڑے ہوئے افراد کے لیے ہوتا ہے
بگڑی ہوئی قوم کے لیے نہیں
بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح
صرف دعوت و تربیت سے ہوتی ہے (ابو یحییٰ)

انسان کی جہالت اصل مسئلہ نہیں ہوتی
اصل مسئلہ جہالت کے باوجود
اپنی بات پر اعتماد ہوتا ہے (ابو یحییٰ)

فرح رضوان

آخری گرہ

یونیورسٹی میں تو داخلہ مل گیا تھا لیکن ہاسٹل میں جگہ نہ مل پائی۔ ناچار ایک نزدیک گھر میں شیئرنگ میں رہنا پڑا۔ قسمت نے ساتھ دیا، روم میٹس اور لینڈ لیڈی سے اچھی بننے لگی، وہاں پرابلم کوئی نہ تھی لیکن دل پر شدید بوجھ رہتا - ہر وقت ایک ناخوشگوار سی کیفیت سے دوچار رہتی، وجہ؟

وجہ تو ہماری لینڈ لیڈی محترمہ ہی تھیں --- وہ ایک درمیانی عمر کی ملنسار عورت تھی لیکن ------ اس کی ایک عادت کی بنا پر میرا یہ احساس بڑھتا ہی جا رہا تھا --- اور جب گھٹن مزید بڑھی تو سوچا کہ اب اس معاملے پر براہ راست بات کرنی چاہیے، سو ایک فرصت کے دن پوچھ ہی ڈالا کہ ، آپ رات تک مصروف رہتی ہیں لیکن ہم ابھی سونے جا رہے ہوتے ہیں کہ پتا چلتا ہے آپ اٹھ بیٹھی ہیں، ہم تو کتنے ہی طرح کے الارم لگا لیں عہد کر لیں لیکن کسی طور فجر پر نہیں اٹھ پاتے اور سارا دن خود پر شرمندہ ہوتے گذر جاتا ہے - یاد نہیں کہ اس بات پر ان کی ہچکچاہٹ سے بھرپور مسکراہٹ زیادہ طویل تھی یا سرد آہ، لیکن پھر بڑی شفقت سے میرا ہاتھ تھام کر بولیں کہ ظالم لڑکی یہ کیا یاد دلا دیا تم نے، اب پوچھا ہے تو سنو!

"کئی سال پہلے میں بھی اسی دور سے گزر چکی ہوں جس سے آج تم گزر رہی ہو، میں بھی کسی صورت فجر پر نہ اٹھ پاتی تھی، دس بہانے ذہن میں آتے کہ رات میں بیمار بچے کی وجہ سے جاگنا پڑا مہمان دیر سے گئے بہن کو فون پر سسرال میں گذارہ کرنے کی نصیحتوں میں وقت لگ گیا یہ سب بھی تو کتنے ثواب کے کام ہیں، لیکن یہ بہلاوے، سورج نکلنے تک کے ہوتے، مر مر کر دن چڑھے آنکھ کھلتی تو ضمیر جینے نہ دیتا، وہ ملامت اور دھتکار کہ کیا بتاؤں، بہر حال خوب توبہ کرتی منہ دھونے

کے ساتھ ہی وضو کر کے ناشتے سے پہلے قضا نماز پڑھتی اور گڑگڑا کر دعا کرتی کہ اللہ پاک فجر کے وقت اٹھنے کے لیئے آسانی فرمادے، سو پھر یوں ہونے لگا کہ میں نے سوچنا شروع کیا کہ شیطان انسان کو تین گرہ لگاتا ہے، جس میں سے ایک تو اٹھتے ساتھ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو کھل جاتی ہے، وہ الحمدللہ میں کرتی ہوں، دوسری جب وضو کرے تب کھل جاتی ہے اور وہ بھی میں کرتی ہوں ،بس یہ منحوس آخری گرہ جو تہجد کے نفل یا فجر کی بروقت نماز سے کھلتی ہے وہی نہیں کھل پاتی اور سارا دن میرا ایک گنجلک سا ہو کر رہ جاتا ہے،بس اب ہر صورت اس آخری گرہ کو کھولنا ہی ہے،اس چلینج کے بعد میں نے فجر پر پورا زور لگا کر اٹھنا شروع کر دیا،اور یہ ہوا اس طرح کہ میں نے فجر کے آخری وقت کا الارم لگانا شروع کر دیا۔ اب الارم بند کر کے واپس سونے کا چانس ہی نہ ہوتا کہ وقت تنگ ہے بھاگو۔ یوں نیند میں جھولتی نفس سے الجھتی وضو کرتے خود کو یہی بہلا وا دیتی کہ بس یہی دس منٹ کی بات ہے پھر سونا ہی ہے،تو میری فجر آخر وقت ہی سہی ملنے لگی،کم از کم یوں دن کے بدترین آغاز سے جان خلاصی ہو گئی تھی لیکن! آخر وقت پر سر سے بوجھ اتارنے والی بات سے میں زیادہ مطمئن نہیں تھی۔اصل میں میرے حالات بہت خراب چل رہے تھے،مر جاؤ لیکن نہ عزت نہ پذیرائی،حالات ایسے تھے کہ سارے تو کسی کو بتائے بھی نہیں جا سکتے تھے اور کسی کو سرسری سے بتاؤ تو ان کا ہر وظیفہ فجر کی نماز میں ہی ہوتا کہ بیٹا یہ ورد کرو یہ سورہ پڑھو،مگر یہ میرے لیے ممکن نہ تھا۔پھر اللہ کے کرم سے میری نظر سے سورۂ اسراء کی یہ آیات گزریں کہ (اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے 78) اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے 79)

اور میرا سارا فوکس پھر اسی پر ہو گیا کہ اسی میں میری نجات اور سارے مسائل کا حل ہے پر سب سے بڑا مسلہ تو میری نیند تھی، بہت دعا بہت کوشش کی پر لگا کہ کوئی فائدہ نہیں۔ پھر ایک دن

بچوں کی ڈھیروں کتابیں سنبھالتے ہوئے خیال آیا کہ ہر سال شروع میں لگتا ہے کہ اتنی کتابیں اتنے چھوٹے بچے کیسے پڑھ پائیں گے لیکن دیکھا جائے تو تمام چھٹیوں کو نکال کر کل آٹھ ماہ بنتے ہیں اور شیڈول کے مطابق چلتے رہنے کے بعد تمام سبق بچوں کو یاد بھی ہو جاتے ہیں سمجھ بھی آ جاتے ہیں، تو یوں میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ فجر میں قرآن پڑھنے کا مطلب کہ یا تو نماز میں پڑھوں جو کہ اس وقت ممکن نہ تھا کہ تب مجھے گنتی کی اور بہت چھوٹی سورتیں یاد تھیں، تب میں نے پکا ارادہ کیا کہ، نماز فجر کے بعد صرف ایک لائن قرآن سے بھی پڑھا کروں گی، اور اس وقت وہ صرف ایک لائن پڑھنا میرے لیے سب سے دشوار ہوا کرتا لیکن الحمدللہ میں ثابت قدم رہی اور میرا نفس اس مشقت کا عادی ہو گیا تب میں نے دو سے تین اور پھر چار لائن پڑھنی شروع کیں۔ جب رمضان آیا تو ایک نئی چیز آشکار ہوئی کہ صرف تیس دن میں سورج کے طلوع اور غروب میں بہت نمایاں فرق آ جاتا ہے، لیکن اندازہ نہیں ہو پاتا اور اسی طرح تو منٹ منٹ کر کے سردیوں کی لمبی راتیں، اور گرمیوں کے طویل دن وجود میں آتے ہیں، سو یہاں سے میں نے دو دو منٹ کر کے اپنے فجر پر اٹھنے کا وقفہ بڑھانا شروع کیا، میرا مقصد اب صرف فجر پر اٹھنا نہیں رہ گیا تھا بلکہ منزل اب تہجد کا خاص وقت تھا جس تک پہنچنے میں سورہ سجدہ کی اس آیت سے بہت مدد ملی کہ (اُن کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں) اور الحمدللہ اس آخری گرہ کے کھلتے ہی زندگی کی ہر گرہ کھلتی چلی گئی۔

جس طرح دنیا میں تجارت بداخلاقی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی
اسی طرح جنت کی تجارت بداخلاقی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی (ابو یحییٰ)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (10)

رینٹ اے کار

باہر نکل کر ہم رینٹ اے کار کے دفاتر تلاش کرنے لگے۔ یہاں اسی قسم کے ایجنٹ گھوم رہے تھے جو سیاحوں کو تاڑ کر انہیں خدمات حاصل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحب ہمیں "یورو پارک" کے دفتر میں لے آئے۔ یہاں موجود صاحب بڑی صاف انگریزی بول رہے تھے۔ انہوں نے مناسب ریٹ پر جدید ماڈل کی ایک فی ایٹ کار کی پیش کش کی۔ ہمارے ہاں تو فی ایٹ کے ٹریکٹر ہی مشہور ہیں مگر یہاں کاریں بھی چلتی ہیں۔

کار کے کاغذات لے کر ہم ایئر پورٹ پارکنگ میں پہنچے۔ یہاں کمپنی کے اسٹاف نے کار کی چابیاں ہمارے حوالے کیں۔ یہ ایک ڈیزل کار تھی۔ یہ ہمارے لئے بہت بہتر تھا کیونکہ ترکی میں پیٹرول دنیا میں شاید سب سے زیادہ مہنگا ہے۔ ڈیزل بھی بہت مہنگا ہے مگر پیٹرول سے کم۔ ان دنوں پیٹرول کی قیمت 3.60 لیرا (175 روپے) اور ڈیزل کی 2.62 لیرا (125 روپے) فی لیٹر تھی۔

گاڑی 2009 ماڈل کی تھی اور صرف 9000 کلومیٹر چلی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود اس میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے ہوں۔ ڈیزل اور پیٹرول کار میں یہی فرق ہوا کرتا ہے۔ سعودی عرب کی طرح ترکی میں بھی لیفٹ ہینڈ ڈرائیو ہی تھی۔ اس وجہ سے اسٹیرنگ الٹے ہاتھ پر تھا مگر گاڑی مینول گیئر کی تھی۔

مجھے سعودی عرب میں آٹو میٹک گاڑی چلانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ مینول گاڑی آخری مرتبہ پاکستان میں چلائی تھی جہاں اسٹیرنگ دائیں جانب ہوتا ہے۔ چنانچہ میں کلچ دبا کر بائیں ہاتھ

سے گیئر تلاش کرنے لگا۔ گیئر کی بجائے میرے ہاتھ میں دروازے کا ہینڈل آیا جسے گیئر سمجھ کر آگے پیچھے کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب یاد آیا کہ یہاں گیئر دائیں ہاتھ سے لگانا پڑے گا۔ اس گاڑی کے پیڈل بھی کچھ عجیب سے تھے۔ ریس، بریک اور کلچ میں فاصلہ بہت ہی کم تھا اور ایک ہی پاؤں سے تینوں کو دبایا جا سکتا تھا۔ اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ کلچ کے بائیں جانب پاؤں رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی جو طویل سفر میں کام آئی۔ پارکنگ فیس کمپنی نے ادا کی ہوئی تھی۔

باہر نکل کر میں نے ریس پر پاؤں رکھا مگر گاڑی کی پک اپ کچھ اچھی نہ تھی۔ سعودی عرب میں تو پاؤں کا ذرا سا دباؤ ملنے پر گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگتی تھی مگر یہاں عجیب ہی معاملہ تھا۔ ڈیزل کی بجائے یہ سی این جی گاڑی لگ رہی تھی۔

استنبول کا پہلا امپریشن

پارکنگ سے باہر نکلے تو استنبول کا پہلا امپریشن بہت ہی اچھا تھا۔ نہایت ہی صاف ستھرا شہر تھا۔ کھلی کھلی سڑکیں اور گھنا سبزہ۔ میں گوگل ارتھ پر کسی حد تک استنبول شہر کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اس وجہ سے سڑکوں کا کچھ اندازہ تھا۔ باہر نکلتے ہی حسب عادت میں نے پہلی غلطی کی اور ایک غلط موڑ کاٹ لیا۔ غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب ہم ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہاں چند دکانیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اس غلطی کا فائدہ یہ ہوا ان دکانوں سے ہم نے پانی، برگر اور آئس کریم خرید لی۔

استنبول کا ماحول کافی مغرب زدہ لگ رہا تھا۔ مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں برگر میں بھی خنزیر کا گوشت نہ ہو۔ اس خیال سے ہی میرا جی متلانے لگا۔ میں نے برگر والے صاحب سے پوچھا، "حلال؟" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئے، ان کے چہرے پر برا ماننے کے تاثرات پیدا ہوئے اور بولے، "حلال!!!" میں نے ان سے پوچھا، "انقرہ یولو؟" ترکی زبان میں "یولو" سڑک کو کہتے

ہیں۔انہوں نے اشاروں کی مدد سے مجھے راستہ سمجھایا۔

اب ہم استنبول انقرہ موٹروے کی طرف جارہے تھے جس پر "بولو" شہر واقع تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ استنبول کو آخر میں دیکھیں گے۔ کچھ دور جا کر ایک سگنل تھا۔ ساتھ والی گاڑی میں ایک صاحب ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ اسٹیرنگ پر رکھے ہوئے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔

استنبول میں دینی شعائر نظر نہیں آرہے تھے۔ ہمارے پاکستان یا سعودی عرب میں جگہ جگہ سبحان اللہ، استغفر اللہ لکھا نظر آتا ہے۔ یہاں ایسا کچھ نہ تھا البتہ ہر چند قدم کے فاصلے پر ایک مسجد نظر آرہی تھی۔ان مساجد کا آرکیٹکچر ایک جیسا تھا۔ایک بڑا گنبد اور اس کے ارد گرد متعدد چھوٹے گنبد۔غالباً یہ عثمانی دور کے مشہور آرکیٹیکٹ "سنان" کی ایجاد تھا۔اس اسٹائل کا مقصد یہ تھا کہ امام یا خطیب کی آواز گنبدوں کے اندر سفر کرتی دور تک چلی جائے۔جب لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہیں ہوا تھا، اس وقت مسلمان انجینئروں نے اس انداز میں آواز دور کے سامعین تک پہنچانے کا اہتمام کیا تھا جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

استنبول شہر، جدید اور قدیم کا ایک خوبصورت امتزاج نظر آرہا تھا۔میں سوچنے لگا کہ ہمارے مذہبی راہنما جدیدیت سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟ سوائے چند ایک چیزوں، جیسے بے حیائی وغیرہ کے، دور جدید کی عمارت عین اسلام کے اصولوں پر استوار ہے۔ مذہبی آزادی ہو یا ویلفیئر اسٹیٹ، تعلیم کا فروغ ہو یا اقلیتوں کے حقوق، صفائی وستھرائی ہو یا جمہوریت، ہر پہلو سے دور جدید اسلام کے اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ چند برائیاں دور جدید میں عام ہوئی ہیں مگر قدیم ادوار میں بھی تو ان سے بھی بڑی برائیاں موجود رہی ہیں۔

[جاری ہے]

حمد

(پروین سلطانہ حنا)

مرے خیال کا محور ہے میرا سب تو ہے
میں خوش گمان ہوں تجھ سے کہ میرا رب تو ہے

مرا وجود گواہی ہے تیری رحمت کی
جو نعمتیں ہیں میسر مجھے سبب تو ہے

فنا بقا کا تسلسل تجھی سے ملتا ہے
مرا حسب، مرا شجرہ، مرا نسب تو ہے

ہر ایک فکر پہ حاوی رہا ہے دھیان ترا
بنی ہے ڈور یہ سانسوں سے دور کب تو ہے

ہیں حروف بانجھ کروں کس طرح ثنا تیری
کہ سارے لفظ ہیں ساکت نظر میں رب تو ہے

ترے ہی نام سے ہے معتبر قلم میرا
مرا خیال، مری فکر اور ادب تو ہے

سزا کے واسطے، روزِ جزا مقرر ہے
یہ آگ بھی ترا جلوہ ہے اور غضب تو ہے

خطائیں میری، کرم تیرا، درگزر تیری
خطائیں بخش دے میری کہ میرا رب تو ہے

جو مانگنا ہو وہ کہنا، ذرا سنبھل کے حنا
وہ سامنے ہے ترے اور بے ادب تو ہے

مسلمانوں کے باہمی حقوق

’’مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔

آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو،

اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

تجسس نہ کرو۔

اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو، تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔‘‘

(الحجرات49:12-10)